© rasailojaraid.com

محسنِ انسانیت (صلی اللہ علیہ وسلم)

(مخالفتوں سے گذرتے ہوئے)

مدنی دور

(بہ سلسلۂ گذشتہ)

طوفان امڈ پڑا تحریکِ اسلامی کے دورِ اوائل میں یہود بہت سے ایسے پہلو دیکھ رہے تھے جن کی بنا پر ان کو آس لگی رہی کہ آہستہ آہستہ یہ تاریخی طاقت ہمارے ہاتھ میں آجائیگی۔ قرآن میں بنی اسرائیل کی بہاتی فضیلت کا ذکر تھا۔ اِنِّی فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ —— ، ان کے انبیاء کی نبوت کی تصدیق تھی، ان ہی کی کتابِ مقدس کی حقانیت کی گواہی تھی، ان کے سامنے تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَۃٍ سَوَاءٍ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ کی اسپرٹ سے دین کی مرکزی حقیقت کو اجاگر کیا جا رہا تھا۔ حضور سرورِ عالم مشرکین کے طور طریقوں کے مقابلے میں یہود کے بعض طریقوں کو پسند فرماتے، مثلاً مشرکین بالوں میں مانگ نکالتے تھے اور یہود نہیں نکالتے تھے، سو آپ نے اس معاملے میں مشرکین کی مخالفت کی اور یہود کی موافقت! جن معاملات میں قرآن میں کوئی حکم اللہ تعالیٰ کی طرف سے وارد نہیں ہوتا تھا ان میں نبئ اکرم بالعموم اہلِ کتاب کی موافقت کرتے[1]۔ مدینہ کے یہودی عاشورا کے دن کا روزہ رکھتے تھے، آپ نے بھی اس دن روزہ رکھا اور مسلمانوں کے لیے عاشورا کا روزہ رکھنا پسند فرمایا۔ کسی یہودی کا جنازہ گذرتا تو آپ کھڑے ہو جاتے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ مسلمانوں کے لیے قبلۂ نماز بیت المقدس تھا۔ یہ ایک کھلی ہوئی علامت تھی کہ تحریکِ اسلامی مشرکین کے مقابلے میں اہلِ کتاب سے زیادہ اقرب تھی۔ امرِ واقعہ در حقیقت یہ تھا کہ یہودیت کا قالب تو اس مذہب کے مفاد پرست مولویوں اور پیروں نے پوری طرح مسخ کر ڈالا تھا، اور یہ قالب بے جان بھی ہو چکا تھا، لیکن موسیٰ علیہ السلام جس دین کو لائے تھے وہ وہی اسلام تھا جسے سارے

---

[1] بخاری، کتاب اللباس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہی انبیاء نے شرائع کے تھوڑے بہت تفاوت کے ساتھ پیش کیا تھا اور اب اسی کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم دنیا کے سامنے رکھ رہے تھے بلکہ ایک نظام کی صورت میں برپا کر رہے تھے۔ یہی رشتہ تھا جس کی بنا پر حضور کو بھی امیدیں تھیں کہ یہود اسلامی جد و جہد کو جوں جوں سمجھیں گے، اس کا خیر مقدم کریں گے اور اس کام کو اپنا کام سمجھیں گے۔ انہیں خوشی ہوگی کہ خدا کے نام کا جھنڈا بلند ہو رہا ہے اور انبیاء کے دیئے ہوئے اصول اخلاق نظامِ زندگی کی بنیاد بن رہے ہیں اور شریعتِ تورات کی اصل قدروں کے بجھے ہوئے دیئے از سرِ نو روشن کیے جا رہے ہیں۔ انہی امیدوں کی فضا میں قرآن نے اپنی دعوت یوں پیش کی تھی کہ اصل سوال گروہ بندیوں کا نہیں، اصول و عمل کا ہے۔ یہودیوں میں سے، عیسائیوں میں سے، صابیوں میں سے اور خود اسلام کے نام لیواؤں میں سے جو کوئی فی الحقیقت خدا اور اس کے قانون اور اس کے انبیاء کی دعوت اور محاسبۂ روزِ جزا پر ایمان لائے اور پھر اپنی زندگی کو عملِ صالح بنا کے دکھا دے تو بس یہ چیز ہے جو مطلوب ہے۔ اصل چیز نام نہیں کام ہے۔ مطلوب ٹھپے نہیں، کردار مال ہے۔ مقصود نسبتیں نہیں، سیرتیں ہیں۔ مسئلہ کسی دھڑے اور جتھے کے مفاد کا نہیں، انسانیت کی مشترک خیر و فلاح کا ہے۔ لیکن نہ یہودیوں کی طرف سے تحریکِ اسلامی کی امیدیں پوری ہوئیں، نہ تحریکِ اسلامی کی طرف سے یہودیوں کی مرادیں بر آئیں۔

اور یکایک تحریکِ اسلامی ایک انقلابی موڑ مڑ گئی۔ یہ موڑ تھا تحویلِ قبلہ کا واقعہ! تحریکِ اسلامی کی بنیادی فطرت ہر دور میں یہ رہی ہے کہ وہ اپنے امتیازی وجود کو نمایاں رکھنا چاہتی ہے اور اپنے افراد کے اندر اصولی و اعتقادی خودی کو زندہ رکھنا چاہتی ہے۔ مکہ میں اسی تقاضے کے تحت بیت المقدس کو قبلہ بنایا گیا تھا تاکہ نظریۂ اسلامی کی علمبردار جماعت کو اپنی جداگانہ حیثیت کا احساس ہو۔ چنانچہ ہجرت تک کے لمبے دور میں مسلمانوں نے مشرکین کے مقابلہ میں اپنی مختلف حیثیت کا پوری طرح احساس کر لیا اور خود مشرکین کو بھی احساس ہو گیا کہ وہ اور مسلمان دو الگ الگ سمتوں میں حرکت کرنے والی طاقتیں ہیں۔ اسی شعور و احساس کی تکمیل تھی جس کا اظہار "لکم دینکم ولی دین" کے مختصر سے قرآنی بول میں کر دیا گیا۔ بات پوری طرح نتھر گئی کہ تمہاری راہ الگ، ہمارا راستہ جدا، ہم میں تم میں کوئی جوڑ میل نہیں۔

اب مدینہ میں آکر جو کچھ بھی اندیشۂ التباس تھا وہ اہلِ کتاب سے تھا اور اب اس امر کی ضرورت تھی

© rasailojaraid.com

کہ تحریکِ اسلامی کو اہلِ کتاب کی بے روح مذہبیت سے ممیز رکھا جائے اور مسلم معاشرے کو یہودی معاشرے میں ذہنی طور پر تحلیل ہونے سے بچایا جائے۔ اب وہ مدت کی وہ ضرورت ختم ہو چکی تھی جس کے تحت بیت المقدس کو عارضی طور پر قبلہ بنا لیا گیا تھا۔ مسلمانوں کا ذہنی رابطہ قبلۂ ابراہیمی ہی سے اقرب تھا اور حضورؐ خود اسی خانوادہ کے چشم و چراغ تھے اور تحریک کے اوّلین جانباز بھی بنو اسمٰعیل سے تعلق رکھتے تھے۔ امتیاز کا وہ عارضی اہتمام اب غیر ضروری تھا۔ یہی وجہ تھی کہ حضورؐ کا قلبِ حقیقت شناس پہلے سے اس تبدیلی کا منتظر رہا، اور اس کا ذکر خود قرآن میں ہے کہ قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِی السَّمَآءِ۔

تحویلِ قبلہ کا فرمان صادر کر کے درحقیقت سلطنتِ زندگی کے فرماں روائے حقیقی نے جہانی امامت کے منصب سے بنی اسرائیل کو معزول کر دیا اور ان کی جگہ ملتِ اسلام کو مامور فرمایا۔ عالمی دعوتِ خیر و فلاح کا جو مرکز پہلے بیت المقدس میں چلا آ رہا تھا وہ اب حرمِ کعبہ کی طرف منتقل کر دیا گیا۔ مسلمانوں کو امتِ وسط یعنی عالمی دعوت کا مرکزی گروہ قرار دیا گیا جس پر شہادت علی الناس کی ذمہ داری ڈالی گئی اور تمام بنی نوعِ انسان کی رہنمائی کا فریضہ عائد کیا گیا۔

سولہ مہینے تک مدینہ میں بیت المقدس کے رخ نماز ادا کی جاتی رہی۔ رجب یا شعبان سنہ ۲ھ کا واقعہ ہے کہ ابنِ سعد کی روایت کے بموجب سرورِ عالم بشر بن براء بن معرور کے ہاں دعوت پر گئے تھے۔ وہاں ظہر کا وقت آ گیا اور آپ لوگوں کو نماز پڑھانے کھڑے ہوئے۔ دو رکعتیں پڑھا چکے تھے کہ تیسری رکعت میں یکایک وحی کے ذریعے یہ آیت نازل ہوئی کہ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ؕ "لو ہم تمہیں اسی قبلے کی طرف پھیر دیتے ہیں جسے تم پسند کرتے ہو۔ سو (اب) مسجدِ حرام کی طرف رخ پھیر دو۔ اب جہاں کہیں بھی تم ہو، اسی کی طرف منہ کر کے نماز پڑھا کرو۔"

اس حکم کے سنتے ہی خدا کا سب سے زیادہ اطاعت شعار بندہ حالتِ نماز ہی میں رخ بدل لیتا ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اس کا اتباع کرنے والے تمام نمازی نئے قبلہ کی طرف مڑ جاتے ہیں۔ بیت المقدس مدینے سے سیدھا شمال میں ہے اور مکہ جنوب میں۔ حالتِ نماز میں قبلہ کی تبدیلی کے معنی یہ ہوئے کہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

امام کو مقتدیوں کے سامنے سے سیدھا پیچھے کی طرف آنا پڑا ہوگا اور نمازیوں کی صف کو بالکل الٹے قدموں گھومنا پڑا ہوگا۔ اس کے بعد مدینہ اور آس پاس کی بستیوں میں عام منادی کرادی گئی۔ براء بن عازب کا بیان ہے کہ ایک جگہ منادی کی آواز اس حالت میں پہنچی کہ لوگ رکوع میں تھے اور وہ اعلان سنتے ہی اسی حالت میں کعبے کی طرف مڑ گئے۔ انس بن مالک کی روایت ہے کہ بنی سلمہ کے ہاں یہ اطلاع دوسرے روز نماز صبح کے دوران میں پہنچی۔ لوگ ایک رکعت پڑھ کر دوسری میں تھے کہ منادی کی پکار سنی اور اسے سنتے ہی پوری جماعت نے اپنا رخ بدل لیا۔[1]

اس تبدیلی پر جو ہنگامہ بپا ہونے والا تھا اس کے بارے میں پہلے سے قرآن نے مسلمانوں کو آگاہ کر دیا۔ سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَّاهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا۔ یعنی نادان اور حقیقت ناآشنا لوگ قیل و قال کا طوفان اٹھا دیں گے کہ ان لوگوں نے کس سبب سے قبلہ بدل ڈالا ہے۔ طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہونگی، عجیب و غریب ذہنی ردِعمل رونما ہونگے اور تعلقات و روابط پر بُرا اثر پڑے گا۔ مسلمانوں کو پروپیگنڈے کے آنے والے طوفان میں مضبوط موقف لے کر کھڑے رہنے کے لیے قرآن نے تحویل قبلہ کی معنویت کو پیشگی ان کے ذہن نشین کرا دیا۔ انہیں بتایا کہ پہلے بیت المقدس کو قبلہ بنانے سے غرض یہ تھی کہ عربیت کے بُت کو توڑا جائے، کیونکہ عرب اپنے قومی دائرہ سے باہر کی کسی چیز کی قدر ماننے کے لیے تیار نہ تھے، اب بیت المقدس سے کعبہ کی طرف رُخ گھما دینے کا مدعا یہ ہے کہ اسرائیلیت کا بُت بھی ٹوٹ جائے۔ ایک کام پہلے ہو چکا تھا، دوسرا اب کر دیا گیا۔ عربیت کے پرستار پہلے چھٹ چکے تھے اور اسرائیلیت کے پرستار اب چھٹ جائیں گے، اس طرح نفاق کے گھن سے نیا اسلامی معاشرہ پاک ہو سکے گا۔ اب اس حلقہ میں وہی لوگ رہیں گے جن کی نگاہ میں اصل احترام اللہ کے فرمان اور اس کے رسول کی سنت کا ہے۔ یہ موڑ جس سے تحریکِ اسلامی گذر رہی ہے رسول کا دامن پورے اعتماد کے ساتھ تھام کر چلنے والوں کو ان تمام بے اصول افراد سے چھانٹ کر الگ کر دے گا جو اس حقیقت پر ایمان رکھتے ہوں کہ مشرق و مغرب سب اللہ کے ہیں اور اصل مرکزِ اطاعت

---

[1] تفہیم القرآن۔ ج ۱ صفحہ ۱۱۹ تا ۱۲۱۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وہ ہے، نیز جو اس نکتہ کے رازداں ہیں کہ نیکی مشرق یا مغرب کی طرف رُخ کرنے کا نام نہیں ہے، بلکہ ان ظاہری اشکالِ شریعت کے اندر کام کرنے والی جس روح کا نام نیکی ہے وہ اللہ تعالیٰ پر، یومِ آخرت پر، فرشتوں پر خدا کی کتابوں اور اس کے پیغمبروں پر ایمان رکھنا اور اس کی راہ میں اپنا مال خرچ کرنا ہے۔ سو تمہیں قبلہ کے ظاہری شعار کو قائم کرنے میں جس چیز کا اہتمام کرنا چاہیے وہ ہے" استبقوا الخیرات" یعنی نیکیوں کی طرف لپکو اور بھلائیوں کی طرف رُخ کرو۔ تمہیں چاہیے کہ تم خدا کے بڑے سے بڑے تغیر آفرین اور انقلاب انگیز حکم کی تعمیل کرنے میں کسی مخالف طاقت سے نہ ڈرو، صرف اسی ایک سے ڈرو۔ اس کا مطالبہ ہے کہ" فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي"!

قرآن نے حاکمِ کائنات کا فرمان سنانے ہی کہہ دیا تھا کہ یہ واقعہ بجز اہلِ ایمان و یقین کے اور ہر کسی پر شاق گذرے گا۔ اس پر جب ہنگامہ کھڑا ہوگا تو گھبراہٹ چھا جائیگی اور گلی گلی وہ کج بحثیاں شروع ہونگی کہ کمزور لوگوں کے سر چکرا جائیں گے اور جذبات میں ایک ہل چل مچے گی۔ اب سنیے کہ قیل و قال کیا کچھ ہوئی۔

مشرکین نے کہا کہ لیجیے اب ہوش کچھ تو ٹھکانے آئی، ہمارا قبلہ اختیار کر لیا ہے تو آہستہ آہستہ یہ لوگ ہمارے مذہب کی طرف بھی از خود لوٹ آئیں گے۔

یہود نے کہا کہ داعیٔ اسلام نے ہماری مخالفت کے جوش میں قبلۂ انبیاء کو چھوڑ دیا، حالانکہ اگر یہ نبی ہوتا تو کبھی بھی اس قبلہ کو نہ چھوڑتا۔

نفاق کے مریض کہتے تھے کہ کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا صحیح قبلہ کدھر کو ہے، اگر پہلا قبلہ برحق تھا تو اب وہ چھوڑ دیا، اور اگر اب دوسرا قبلہ درست ہے تو پہلے جو کچھ تھا وہ غلط تھا۔ قبلہ کیا بڑا کھیل ہو گیا، جی چاہا اِدھر منہ موڑ لیا، جی چاہا اُدھر رُخ کر لیا! یہ تو سارا مذہب ہی بس مرضی کا کھیل ہے۔

اور جو لوگ ایمان و یقین کی روح سے مالا مال تھے انہوں نے کہا کہ ہم نے حکم کو سنا اور اس کی اطاعت قبول کی اور ہم اس پر ایمان لائے، یہ سب کچھ ہمارے پروردگار کی جانب سے ہے[1]!

یہی اہلِ ایمان بیچارے پروپگنڈہ کی آندھی میں گھر گئے اور چاروں طرف سے سوالات، بحثوں اور طنز و

---

[1] زاد المعاد ج ۲ ص ۵۸

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تضحیک کے تیروں کی بوچھاڑ شروع ہوگئی۔ مجلس مجلس معرکہ آرا گفتگوئیں تھیں، گلی گلی ہاؤ ہو مچ رہی تھی، لمحہ لمحہ جذباتی ہیجان پیدا ہوتے تھے۔ انقلابی تحریکوں میں ہر بڑی تبدیلی اور ہر بڑے موڑ پہ اور لوگوں کے خیالات کے بتوں کو توڑنے والے ہر اقدام پر اس طرح کے طوفانی ہنگامے پیش آجاتے ہیں اور ایسے حالات میں ان کے کارکن گھبراہٹ اور پریشانی میں مبتلا ہو کر بسا اوقات اشتعال کی حد تک جا پہنچتے ہیں۔

اس اندیشے کے پیش نظر نصیحت کر دی گئی کہ ان گردابوں کو پار کرنے کے لیے صبر و صلوٰۃ کے مضبوط سفینے ہی کارآمد ہو سکتے ہیں۔ مخالفانہ پروپگنڈہ کرنے والوں کے بارے میں بتایا گیا کہ ان کا مقصود تلاشِ حق ہرگز نہیں ہے اور یہ دلائل سے مطمئن ہونے پر بالکل تیار نہیں ہیں۔ ان کے سوالات کا مدعا محض پریشان کرنا ہے۔ یہ اس وقت تک راضی نہیں ہو سکتے جب تک کہ تم لوگ اپنا اصول اور نظام چھوڑ کر ان کی مریدی نہ اختیار کر لو۔

بیہودہ نکتہ طرازیوں کے جواب میں اتمامِ حجت کے طور پر تحریک اسلامی کی طرف سے سنجیدہ و متین انداز سے زوردار استدلال کیا گیا اور عوام الناس کے سامنے کعبہ کی عظمت کو سورۂ آل عمران کے ایک خطاب میں واضح کر دیا گیا۔ ارشاد ہوا:۔

"بے شک سب سے پہلی عبادت گاہ جو انسانوں کے لیے تعمیر ہوئی وہ وہی ہے جو مکہ میں واقع ہے۔ اس کو خیر و برکت دی گئی تھی اور تمام جہان والوں کے لیے مرکزِ ہدایت بنایا گیا تھا۔ اس میں کھلی ہوئی نشانیاں ہیں، ابراہیمؑ کا مقامِ عبادت ہے اور اس کی شان یہ ہے کہ جو اس میں داخل ہوا مامون ہو گیا۔ لوگوں پر اللہ کا یہ حق ہے کہ جو اس گھر تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو وہ اس کا حج کرے، اور جو کوئی اس حکم کی پیروی سے انکار کرے تو اسے معلوم ہو جانا چاہیے کہ اللہ تمام دنیا والوں سے بے نیاز ہے۔"

(آل عمران - ۹۶- ۹۷)

بیت المقدس کے متعلق یہ حقیقت خود بائبل سے ثابت تھی کہ اسے حضرت موسیٰؑ کے ساڑھے چار صدیاں بعد حضرت سلیمانؑ نے تعمیر کرایا تھا۔ اور دورِ سلیمانی ہی میں اسے خدا پرستوں کا قبلہ مقرر کیا گیا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تھا۔اس کے برعکس تاریخی اور مذہبی دونوں طرح کی متفقہ اور متواتر روایات سے یہ ثابت تھا کہ کعبہ کو حضرت ابراہیمؑ نے استوار کیا تھا اور حضرت ابراہیمؑ حضرت موسیٰؑ سے آٹھ نو صدیاں قبل ہو گزرے تھے۔کعبہ کی زمانی اولیت کے ساتھ ساتھ یہ بتایا گیا کہ اس کے پر تقدس ماحول میں بڑی اہم نشانیاں ہیں، اس میں دین کی بیش قیمت روایات جگمگا رہی ہیں۔نیکی کی علمبرداری کی ایک تاریخ اس کے سنگ و خشت پر مرقوم ہے؛ پھر اس میں ابراہیم علیہ السلام کی جائے عبادت واقع ہے جس کے سرچشمہ سے آج بھی ذوقِ توحید سیراب ہو سکتا ہے۔پھر اس مرکزِ عبادت کا مقبول بارگاہِ حق ہونا اس آیتِ بیّنہ سے آشکارا ہے کہ لق و دق صحرا میں تعمیر ہونے والی اس عمارت کے آس پاس ایک انسانی دنیا آباد ہو گئی ہے اور اس کی طرف لمبے لمبے فاصلے طے کر کے لوگ کھچے چلے آتے ہیں۔پھر اس کے علوِ مرتبہ کی روشن دلیل یہ ہے کہ بے آب و گیاہ وادی کے آباد کاروں کے پاس ہر طرح کا رزق از خود پہنچ رہا ہے۔اور سب سے بڑھ کر یہ کہ عرب کے جنگجو بدوی معاشرے کے طوفانی سمندر میں یہ گھر چار ہزار برس سے ایک جزیرۂ امن بنا کھڑا ہے۔جو کوئی اس کے دائرۂ حرمت میں داخل ہو جاتا ہے اس کے جان، مال اور آبرو کو تحفظ مل جاتا ہے، ایک دوسرے کے خون کے پیاسے اس کے سائے میں آکر تلواریں نیام میں کر لیتے ہیں اور جذبات کی باگیں تھام لیتے ہیں، قاتل اور ڈاکو اس کی فضا میں سانس لیتے ہی امن پسند شہریوں میں بدل جاتے ہیں۔سو اس گھر کا حق تھا کہ یہ ابراہیم علیہ السلام کی دعوت کا علم بلند کرنے والی تحریک کا روحانی مرکز قرار پائے۔اس میں دین یا عقل کے خلاف آخر کونسی بات واقع ہوئی ہے کہ اس پر گلی گلی چہ میگوئیاں کی جا رہی ہیں۔

اس استدلال کا اگر کوئی نتیجہ خیز تھا تو وہ صرف عوام کے لیے تھا۔رہے یہود، سو انہوں نے تو تحویلِ قبلہ کے واقعہ کو مسلمانوں کی طرف سے ایک فیصلہ کن مخالفانہ اقدام قرار دیا جس کی وجہ سے ان کی وہ تمام امیدیں ختم ہو گئیں جو وہ مسلمانوں کے بارے میں دلوں کے اندر باندھے بیٹھے تھے۔انہیں معلوم ہو گیا کہ یہ جماعت سستا شکار نہیں ہے۔دوسری طرف مسلمانوں پر بھی یہود کی نفسیات کے وہ تمام تاریک گوشے آشکارا ہو گئے جن کے ہوتے ہوئے وہ حسن ظن برقرار نہ رہ سکتا تھا جس کے ساتھ تعلقات کا آغاز کیا گیا تھا۔ان کو اندازہ ہو گیا کہ مدینہ میں بھی تحریک کو بس اپنے بل بوتے پر چلنا ہو گا اور مذہب و تقویٰ کے کاروباری اجارہ داروں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے کسی تعاون و حمایت کی امیدیں باندھنا فضول ہے، بلکہ اُلٹا یہ خطرہ آہستہ آہستہ محسوس ہونے لگا کہ یہود کفار و مشرکینِ مکّہ سے زیادہ گھناؤنے جذبات کے ساتھ تحریکِ حق کی راہ میں روڑے اٹکائیں گے۔ اس کے باوجود حضورؐ اور آپؐ کے رفقائے تحریک کا طرزِ عمل داعیانہ اخلاق پر استوار رہا اور جیسے کو تیسا کے اصول پر یہود اور دوسرے مخالفین سے کوئی معاملہ نہیں کیا گیا۔ کج بحثیوں اور طنز و تضحیک اور چھچھورپن پر مسلمان طرح دے جاتے، بات کرنی پڑتی تو مہذب اور معقول طریق سے استدلال کرنے پر اکتفا کرتے اور زیادتیوں پر عالی ظرفی سے صبر کرتے۔

بہرحال اب دلوں میں بھرا ہوا طوفان بند توڑ کر امڈ پڑا۔

بدتمیزیاں اور بیہودگیاں

جو لوگ خود کوئی تعمیری نصب العین نہیں رکھتے وہ کسی تعمیری کام کو محض اس لیے نہیں ہونے دینا چاہتے کہ اس کی وجہ سے ان کا کھوکھلا پن دنیا بھر کے سامنے بے نقاب ہونے لگتا ہے یہی صورت یہود کی تھی۔ وہ برسوں سے مدینہ کے ماحول پر چھائے ہوئے تھے لیکن کبھی وہ اس قابل نہ ہوئے کہ پستیوں میں گری ہوئی انسانیت کو بلندیٔ کردار پر لاسکیں، لوگوں کے ذہنوں کا تزکیہ کرسکیں اور ان کے اخلاق سنوار سکیں اور ان کو نظم اور تہذیب سکھا سکیں، ان کو امن و سلامتی کا کوئی نظام دے سکیں۔ وہ گری ہوئی انسانیت کو تو کیا سہارا دیتے خود اپنے آپ کو سنبھالنے کے قابل نہ تھے۔ دنیا کا ہر روگ ان کے رگ و پے میں سرایت کرچکا تھا۔ اور وہ اپنے کسی روگ کا درماں کرنے کی سوجھ بوجھ نہ رکھتے تھے۔ اب جب ان کی آنکھوں کے سامنے ایک نئی طاقت ابھری اور اس نے لوگوں کے دل و دماغ میں زندگی بخش اصول و اعتقاد کے چراغ جلانے شروع کیے، ان کے کردار کے کھنڈروں کو صاف کرکے تعمیرِ نو کا آغاز کیا، ایک مقدس نصب العین کے سانچے میں ڈھال کر افراد تیار کرنے اور ان افراد کے بل پر ایک نظامِ امن و عدل کی تاسیس کرنے کی مہم شروع کردی تو یہود جھنجھلا اٹھے اور اس تعمیری تحریک کو ناکام کرنے کی ہر گھٹیا سے گھٹیا تدبیر اختیار کی۔ اس طرح کی منفی اور تخریبی طاقتیں جب کسی کی مخالفت پر کمر باندھتی ہیں تو شرافت اور معقولیت اور تہذیب کو اٹھا کے بالائے طاق رکھ دیتی ہیں۔ نہایت کمینگی کے ساتھ بدتمیزیاں کرنا ان کی شانِ تقدس کو گوارا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ بدتمیزیوں کا محاذ بھی کھول دیا گیا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان جانشینانِ انبیا اور علمبردارانِ کتابِ الٰہی اور مسند نشینانِ درس و افتاد نے بغض و عناد کے میخانے سے جام کے جام چڑھا کر جن کرتوتوں کا مظاہرہ کیا ان میں سے دو تین مثالیں یادگار رہیں گی۔ مذہب و تقویٰ کے یہ اجارہ دار جب حضور سرورِ عالم سے ملتے تو "السلام علیک" کہنے کے بجائے زبان کو ذرا سا گھما کر "السلام" سے حرفِ لام کو غائب کر دیتے تھے یعنی "السام علیک" کہا کرتے۔ اس کلمہ کے معنی یہ تھے کہ اے مخاطب! تجھ پر موت وارد ہو۔ یہ سلوک کیا جا رہا تھا اس جلیل القدر ہستی سے جو ابراہیم اور موسیٰ اور یعقوب اور یوسف اور اسحٰق اور اسمٰعیل علیہم السلام ہی کے پیش کردہ پیغام کی تجدید کے لیے سرگرم عمل تھی، جو تورات کی اصل روح کی تجدید کرنے میں منہمک تھی، جو شریعتِ الٰہی اور قانونِ آسمانی ہی کے احیاء کے لیے محوِ جہاد تھی؛ بلکہ کہنا چاہیے کہ جو دراصل یہود کے فراموش کردہ فریضہ کو ادا کر رہی تھی اور انہی کا چھوڑا ہوا کام کر رہی تھی۔ ایک مرتبہ یہ اقدس مآبانِ مدینہ پیغمبرِ حق کے گھر پر آئے تو غنڈوں اور کمینوں کا سا یہی لعنت استعمال کیا۔ اس بدتمیزی پر حضرت عائشہ نے پردے کے پیچھے سے سخت ردِ عمل دکھایا۔ وہ غصے میں جواب دیئے بغیر نہ رہ سکیں اور کہہ اٹھیں کہ کم بختو! تم پر موت وارد ہو۔ سرورِ عالم کے کان میں یہ آواز پڑ گئی، آپ نے ام المومنین کو سمجھایا: "عائشہ! نرمی سے کام لو!" حضرت عائشہ نے عرض کیا: "کچھ آپ نے سنا بھی کہ انہوں نے کیا کہا تھا؟" فرمایا: "سنا تو تھا، لیکن میں نے بھی "وعلیک" کہہ دیا، یہ کافی ہے!"

بدتمیزی کی دوسری مشہور شرمناک مثالیں جن کا ریکارڈ قرآن نے ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا، ملاحظہ ہوں:

ایک یہ کہ بزمِ رسالت میں یہ اجارہ دارانِ تقویٰ رونق افروز ہوتے اور دورانِ گفتگو میں جہاں کہیں یہ کہنے کی ضرورت پیش آتی کہ ذرا ٹھہریئے، ہمیں بات کو سمجھنے کا موقع دیجیے تو اس موقع پر ایک ذو معنی لفظ استعمال کرتے۔ کہتے رَاعِنَا۔ اس لفظ کا ظاہری مطلب تو وہی تھا کہ ہماری کچھ رعایت فرمایئے، ہماری بات سن لیجیے، ہماری جانب توجہ رکھیے۔ مگر دوسری طرف عبرانی زبان میں اس سے ملتا جلتا لفظ اس معنی میں استعمال ہوتا تھا کہ "سن تو بہرا ہو جائے"۔ علاوہ بریں عربی زبان میں بھی قریبی مادّوں سے اس کے ہم صوت الفاظ ایسے موجود تھے جن سے معانیٔ سُو نکلتے تھے۔ مثلاً رعَث ۔ رعثًا سے ایک لفظ تھا "الرعاع" جس کے معنی تھے "سفلۃ الناس"۔ اس کو رعاعِنا کی شکل دینا کچھ مشکل نہ تھا۔ اسی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

طرح رَعَن سے رعنا ؤ رعین میں جاہل اور بے عقل ہونے کے معنی پائے جاتے تھے۔ خدا سازبان کو لوڑ لچکا کر اسے "راعینا" بھی بنایا جا سکتا تھا اور اس صورت میں معنی ہوتے تھے "اے ہمارے چرواہے، اسے ہمارے گڈریے"! یہ مختلف صورتیں تھیں جنہیں علمائے یہود بآں ہمہ جبہ و دستار مسمسی صورت بنا بنا کر اختیار کرتے تھے۔ عوام بیچارے بھلا لغت وادب کے اتنے ماہر کہاں ہو سکتے تھے۔ یہ علمائے گرامی قدر تھے جو گھروں سے خوب تیاری کر کر کے آتے کہ آج کیا کیا بدتمیزیاں کی جانی چاہئیں۔ ان ہستیوں میں سے کم سے کم ایک، یعنی رفاعہ بن زید بن تابوت کے متعلق تو تاریخ میں واضح روایت محفوظ ہے کہ اخلاق و شرافت کی اس شاندار مثال کے قائم کرنے میں اس یہودی مولوی نے بھی حصہ لیا تھا یعنی ظاہراً دیکھیے تو بڑی شائستگی تھی، لیکن دلوں کی گہرائیوں میں اتر سیئے تو اندر غنڈوں کی سی نفسیات کام کر رہی تھیں۔ آپس میں جانتے تھے کہ ہم وقت کی ممتاز شخصیت کا مذاق اڑا رہے ہیں، لیکن اگر کوئی ٹوک دیتا تو ارشاد فرماتے کہ واہ ہمیں تم نے بدتمیز سمجھا ہے۔ ہم تو ادب و احترام کے ساتھ عرض کر رہے ہیں کہ خدا ہمیں سمجھنے سمجھانے کا موقع دیجیے!

دوسری یہ کہ دورانِ گفتگو میں محسنِ انسانیتؐ کو اکثر یہ جانشینانِ انبیا و رسل یوں خطاب کرتے: "اِسمَع غَیرَ مُسمَع"۔ اس کا ظاہری مطلب یہ تھا کہ ذرا سنیے، آپ کا احترام اس میں مانع ہے کہ آپ کو کوئی بات آپکی مرضی یا اجازت کے بغیر سنائی جا سکے۔ لیکن ان کی شر پسندانہ ذہنیت اس سے ایک اور مفہوم مراد لیتی۔ یہ کہ تم اس قابل نہیں ہو کہ تم کو کوئی بات سنائی سمجھائی جائے۔ اور یہ کہ خدا کرے تم بہرے ہو جاؤ، سننے کے قابل ہی نہ رہو۔

یہ گندا ذہن و کردار تھا جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے کے لیے اٹھا تھا!

تیسری یہ کہ اہلِ ایمان حضورؐ کی مجلس میں بیٹھ کر جب کوئی ارشاد سنتے اور سمجھ لیتے تو ہدایت الٰہی کے تحت جذبۂ صادق سے پکار اٹھتے "سمعنا و اطعنا" ہم نے ارشاد کو سن لیا اور ہم نے اس کی اطاعت اختیار کر لی۔ لیکن حاملینِ تورات ایسے موقعے پر بڑی ڈرامائی حرکت کرتے پہلے زور سے پکارتے: "سمعنا —— جی ہاں، ہم نے سن لیا ہے"۔ پھر ذرا دھیمی آواز سے زبان کو لچکا کر اطعنا کے بجائے کہتے "عصینا" —— ہم نے تمہاری بات کو رد کیا، نافرمانی کا عزم کر لیا ہے۔ یہاں بھی وہی مشکل کہ کوئی گرفت کرتا تو تیوری

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چڑھا کر کہتے کہ تم نے ہم لوگوں کو اتنا نامعقول سمجھ لیا ہے، مخالفت کے جوش میں آکر ہم پر ایسی گھٹیا حرکت کا الزام لگاتے ہو، تم میں اپنے سے باہر کے علماء اور بزرگوں کا احترام باقی نہیں رہا، اپنے علاوہ کسی کو تم شریف اور معقول ماننے پر تیار نہیں ہو؟

غور فرمائیے کہ آخر اس طرح کی ذلیل حرکتوں سے کیا محسنِ انسانیت کے پیغام میں کیڑے پڑ چلے تھے؟ کیا اس بازاری اندازِ گفتگو کے زیرِ اثر سچائی اور انصاف کی اسلامی تحریک کی قدر و قیمت ختم ہو سکتی تھی؟ کیا اس کمینگی کے زور سے اسلامی جماعت کا وجود مٹ چلا تھا؟ گالیاں دینے اور منہ چڑانے سے کسی تعمیری طاقت کا ایک بال بھی بیکا نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ اس میں سارا مزہ صرف اس قدر ہوتا ہے کہ مقابل کی جامد منفی اور تخریبی طاقت کے دل کا بخار نکل جاتا ہے۔ یہ بزرگ جب بزمِ نبوت میں اس طرح کے کارنامے انجام دے کر رخصت ہوتے ہونگے تو اپنی محفلوں میں جا کر فخر کرتے ہونگے کہ آج تو جی بس ہم ان نبی صاحب کو یہ اور یہ کہہ آئے۔ مریدوں میں بیٹھ کر اپنی قابلیت کا سکہ جماتے ہونگے کہ ہم نے لفظوں کے الٹ پھیر سے کیا کیا مطلب نکالے اور چسپاں کیے ہیں۔ اور ہمارے صرف و نحو اور فصاحت و بلاغت کے علم نے اس معرکے میں ہمیں کتنی مدد بہم پہنچائی ہے۔

بزرگانِ یہود کے ان کارناموں میں عبرت کا درس یہ ہے کہ مذہبی لوگ جب انحطاط کا شکار ہوتے ہیں تو ان میں تحریفِ کلمات کی گندی بیماری پیدا ہو جاتی ہے، دوسرے ان کے اندر سے انسانیت اور شرافت اور تہذیب کے تقاضوں کا لحاظ بالکل ختم ہو جاتا ہے۔ تیسرے ان کی حرکات کے ظاہر و باطن میں شرمناک تضاد پیدا ہو جاتا ہے۔ چوتھے ان میں ایک طرح کی بزدلی پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے وہ سیدھے سیدھے طریق سے دل کے گندے جذبات کو اگل بھی نہیں سکتے، بلکہ اپنی بدطینتی پر شرافت کی جعلی جھلیاں چڑھا چڑھا کر لاتے ہیں۔ یہ ایسی علامات ہیں جو کسی ذہن و فکر کے فاسد ہونے کی قطعی دلیل ہوتی ہیں۔ علی الخصوص بدزبانی اور بازاری اندازِ خطاب جہاں بھی پایا جائے وہاں حق اور انصاف اور سچائی سے کوئی تعلق باقی نہیں رہ سکتا۔ آدمی کا ہر ہر بول اور اس کا اندازِ گفتگو اس کی سیرت کا اسی طرح ترجمان ہوتا ہے جس طرح کھانے کی کسی دیگ میں سے اس کی خوشبو پھیل کر دور دور تک کھانے کی نوعیت اور اس کے مسالوں کے معیار کا اعلان کر دیتی ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اب اگر کسی دل و دماغ کی دیگ سے بدزبانی اور بدتمیزی کی شراندا ٹھ رہی ہو تو کیسے توقع کی جاسکتی ہے کہ اس کے اندر پاکیزہ خیالات اور شریفانہ جذبات سے ترکیب پاکر کوئی اعلیٰ سیرت پک رہی ہوگی۔ جب کسی شخص کو دیکھو کہ وہ اختلاف کرنے والوں کے خلاف بدزبانی اور بدتمیزی کی سطح پر اتر آیا ہے تو سمجھو کہ یہ اس کے مقابلے میں دلیل کی بازی بھی ہر چکا اور اخلاق کے مقابلے میں بھی شکست کھا چکا۔ اب یہ ہرا ہوا کھلاڑی محض دل کا بخار نکال رہا ہے۔ اور دل کا بخار نکالنے والی طاقتیں تاریخ میں کوئی اثر نہیں پاسکتیں۔ وہ بس دل کا بخار نکالتی رہتی ہیں اور تعمیری دعوتوں کے قافلے گام بہ گام آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

اتنے ہی پر بس نہیں ہو جاتی، مدینہ میں جب اذان کی ابتدا ہوئی تو چونکہ یہود کے روایتی مسلک کے خلاف یہ بھی نظام مذہب میں ایک بدعت تھی، لہٰذا وہ اس پر بھی بڑا پیچ و تاب کھاتے۔ خصوصاً وہ دیکھ رہے تھے کہ اذان کے کلمات اسلام کی پوری کی پوری انقلابی دعوت اور اس کے بنیادی نظریے کو جامعیت سے سامنے لے آتے ہیں اور دن میں پانچ مرتبہ ان کا پکارا جاتا ہے۔ اور اونچی اور خوش آہنگ آواز میں پکارا جانا ایک مؤثر ذریعۂ نشر و اشاعت ہے۔ یہ آواز ان کی عورتوں، ان کے بچوں اور ان کے غلاموں کے کانوں میں پڑتی، ہر روز پڑتی اور پانچ پانچ بار پڑتی۔ تصور کیجیے کہ جب یہ انوکھی آواز بلالی سوز و ساز کے ساتھ گونجتی ہوگی تو مدینہ کی ساری فضا میں سناٹا چھا جاتا ہوگا، اپنوں پرایوں کے دل متوجہ ہو جاتے ہونگے۔ خصوصاً ان کو وہ فرق محسوس ہوتا تھا جو گھنٹے اور ناقوس بجانے اور اذان پکارنے میں تھا اور جس کے بارے میں خود ان کے عوام بھی کچھ نہ کچھ احساس کرتے ہونگے گھنٹے اور ناقوس کی آواز بس آواز تھی، اس میں نہ الفاظ تھے نہ معنی تھے، بخلاف اسکے اذان کی آواز چند بولوں اور چند کلموں پر مشتمل تھی جن میں عام فہم معانی موجزن تھے۔ گھنٹے اور ناقوس کی آواز میں انسانی جذبات کا اظہار نہیں تھا، لیکن اذان کی پکار میں انسانی قلب کا سوز و گداز کار فرما ہوتا تھا۔ اس فرق کو محسوس کر کے یہود بجائے اس کے کہ یہ اعتراف کر لیتے کہ اذان فی الواقع عبادت کی دعوت دینے کا بہتر اور مؤثر ذریعہ ہے اور اس کے کلمات قدر و قیمت رکھتے ہیں، وہ چڑ میں مبتلا ہو گئے۔ اپنی مجلسوں میں صحبتوں میں وہ اذان پکارنے والے کی آواز کو عجیب و غریب تشبیہیں دیتے، وہ نقلیں اتارتے اور اذان کے کلمات کو بگاڑ بگاڑ کر سامانِ تضحیک پیدا کرتے۔ حسد اور کینہ ان مذہب داروں کو بھانڈوں کی سطح تک جا گراتا تھا۔ مگر جو کام اذان کر رہی تھی اس کی روک تھام تضحیک اور نقالی اور بھانڈپن سے کیسے ہو سکتی تھی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بدتمیزیوں کی آخری حد یہ تھی کہ خود اللہ میاں کو بھی (نعوذ باللہ) نشانہ بنالیا گیا۔ مثلاً جب یہ آیت اتری کہ "من ذالذی یقرض اللہ قرضا حسنا۔ یعنی کون ہے جو اللہ کو اچھا قرض دے۔ تو بجائے اس کے کہ اس کے سیدھے صاف مفہوم کو اخذ کیا جاتا، یہود نے یہ کہہ کر مذاق اڑانا شروع کیا، لوگو! سنتے ہو، اب تو اللہ میاں بھی قلاش ہوگئے ہیں، لو اب وہ بندوں سے قرض مانگنے نکل کھڑے ہوئے ہیں۔ خدا سے بے خوفی اور بے شرمی کی اس سے زیادہ ناپاک مثالیں کم ملتی ہیں۔

اسی طرح قرآن میں جہاں مکھی اور مچھر یا ایسی ہی بظاہر حقیر چیزوں کا بطور مثال تذکرہ ہوا ہے اور ان کے وجود سے کوئی استدلال کیا گیا ہے، وہاں یہ لوگ ملذذ تحقیر کا طوفان مچانے کا موقع پالیتے۔ کہتے کہ ان مسلمانوں کا خدا بھی عجیب ہے کہ جسے مثال دینے کے لیے بھی ملتی ہیں تو ایسی حقیر چیزیں ملتی ہیں۔ اس استہزاء میں یہ استدلال بھی شامل ہوتا کہ قرآن خدا کا کلام کیسے ہوسکتا ہے جبکہ اس کے اندر ان گھٹیا چیزوں کا تذکرہ ہے۔ ان لوگوں کو کیا خوب جواب ملا کہ:

"ہاں، اللہ اس سے ہرگز نہیں شرماتا کہ مچھر یا اس سے بھی حقیر تر کسی چیز کی تمثیلیں دے۔ جو لوگ حق بات کے قبول کرنے والے ہیں وہ انہی تمثیلوں کو دیکھ کر جان لیتے ہیں کہ یہ حق ہے، جو ان کے رب ہی کی طرف سے آیا ہے، اور جو ماننے والے نہیں ہیں وہ انہیں سُن کر کہنے لگتے ہیں کہ ایسی تمثیلوں سے اللہ کو کیا سروکار؟" (البقرہ - ۲۶)

مضحکہ انگیز مطالبہ یہود کی بدتمیزی طلب حجت کی شکل اختیار کر کے ایک عجیب مضحکہ انگیز مطالبہ بن گئی حضورؐ سے کہنے لگے "لولا یکلمنا اللہ" (البقرہ - ۱۱۷) آخر یہ کیا جھمیلا ہے کہ خدا تمہاری طرف ایک فرشتہ در پردہ بھیجتا ہے اور بالا بالا ہی تم تک اپنی بات پہنچا دیتا ہے۔ کیوں نہیں وہ سامنے آکر ہم سے براہِ راست بات کرتا کہ وہ چاہتا کیا ہے۔ وہ زمین پر اترے، آنکھوں سے دکھائی دے اور ہم سے روبرو کہے کہ یہ اور یہ میرے احکام ہیں ان کو مانو اور یہ شخص میرا پیغمبر ہے اس کا دامن تھام کر چلو۔ یہ نہیں تو کم سے کم اتنا ہی کرے کہ کوئی صریح اور قاطع نشانی بھیجدے جس کے بعد کسی کو مجالِ انکار نہ رہے کہ تم اس کے نبی ہو اور قرآن اس کا کلام ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بہ خاطر نشانی بھی انہوں نے متعین صورت میں تیار کی جو ان کو مطمئن کر سکتی تھی۔ تاریخ و سیرت کے ریکارڈ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مطالبہ یہود کے حلقوں میں بڑی اہمیت اختیار کر گیا تھا، دیر تک اس کا چرچا رہا اور بار بار یہ آپؐ کے سامنے دہرایا گیا۔

پہلے سنیے کہ یہ مضحکہ انگیز مطالبہ پیدا کیونکر ہؤا؟ صورتِ واقعہ یہ تھی کہ مدینہ کے یہود حضورؐ کی بعثت سے قبل اوس اور خزرج کو زک دینے کے منصوبے بنا بنا کر آنے والے نبی کی فوری آمد کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔ جب حضورؐ کی نبوت کا آفتاب طلوع ہو گیا تو یکایک انہوں نے پینترا بدل لیا اور انکار اور سرکشی کے مورچوں پر ڈٹ گئے۔ ان کی اس قلب ماہیت پر عام لوگوں میں عجیب سی حالتِ استعجاب پیدا ہو گئی۔ لوگ آ آ کر ان سے پوچھتے کہ یہ قصہ کیا ہے کہ پہلے آپ ہی حضرات یہ دعائیں مانگتے تھے اور ایک نبی کی آمد کا مژدہ سناتے تھے اور اب آپ خود ہی آنے والے کی آمد پر بگڑ بیٹھے ہیں۔ خصوصاً ایک مجلس میں معاذ بن جبل اور بشر بن براء بن معرور جیسے ذہین اکابر نے یہودی بزرگوں سے صاف صاف کہا کہ "اے گروہ یہود! اللہ سے ڈرو اور سرِ تسلیم خم کر دو، کیونکہ تم ہمارے خلاف تائید حاصل کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ سے خود ہی بعثتِ محمدی کی آرزوئیں کیا کرتے تھے اور ہمارا حال یہ تھا کہ ہم اہل شرک تھے اور تم ہی ہمیں یہ خبر سنایا کرتے تھے کہ وہ مبعوث ہو چکا ہے اور پھر تم اس کے اوصاف ہمارے سامنے گنوایا کرتے تھے"۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ایسی گفتگوؤں میں کس بُری طرح یہودی ذہن کا پول کُھل جاتا ہو گا اور وہ خود محسوس کر لیتے ہوں گے کہ ہمارے متعلق مخاطبین کی رائے کیا ہے۔ اپنی شانِ دیانت و تقویٰ کے بچاؤ کے لیے ناگزیر تھا کہ وہ ایک نہ ایک ڈھال فراہم کرتے۔ وہ ڈھال کیا تھی؟ اسے معلوم کرنے کے لیے اوپر کی بات کا جواب سنیے جو بنی نضیر کے ایک بزرگ سلام ابن مشکم کی زبانِ مبارک سے صادر ہؤا۔ فرماتے ہیں: "محمدؐ اپنے ساتھ کوئی ایسی نشانی نہیں لایا جس کے ذریعے ہم اسے بہ حیثیت نبی کے پہچان سکتے، لہٰذا یہ وہ شخص نہیں ہے جس کے بارے میں ہم تم سے تذکرہ کیا کرتے تھے"[1]۔ یہی بات ابو صلوبا فطیونی نے خود محسنِ انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم سے براہِ راست بھی کر دی تھی۔ یعنی ایک فیصلہ کن نشانی چاہیے تھی ــــ اور اس کا تعین کرنا یہود کا کام تھا، وہ جیسی نشانی

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۱۹۶

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا بھی چاہیں، مطالبہ کریں! اسی طرح لوگوں کی طرف سے اس میثاق کا سوال اٹھایا گیا جو نبی آخر الزماں کے بارے میں سابق انبیاء سے انہوں نے استوار کیا تھا تو اس پر بھی ان لوگوں نے آئیں بائیں شائیں کر دی۔ مالک بن الصیف نے ایک بار صاف صاف کہہ دیا کہ "خدا کی قسم، محمدؐ کے بارے میں ہم سے کوئی عہد نہیں لیا گیا۔"[1]

ان کے لیے قرآن کے پاکیزہ کلام اور ہل چل مچا دینے والے استدلال میں کوئی نشانی نہ تھی، محسن انسانیت کے کردار میں کوئی نشانی نہ تھی، زندگی کا نقشہ بدلنے والی تحریک کی لہروں میں کوئی نشانی نہ تھی، علمبرداران حق کی پروان چڑھتی ہوئی جماعت میں کوئی نشانی نہ تھی، ان قربانیوں اور جانبازیوں میں کوئی نشانی نہ تھی جو مٹھی بھر مسلمان ظلم و تشدد کے ہتھیاروں سے کام لینے والی بااثر طاقتوں کے مقابلے میں دکھا رہے تھے۔ ان کو تو بس کوئی عجوبہ اور کوئی تماشا چاہیے تھا۔

اب سنیے کہ کس نشانی کا مطالبہ تھا!

رافع بن حریملہ اور وہب بن زید حضور سرور کائنات کی خدمت میں آئے، باتیں ہوئیں، کہنے لگے کہ:-

"اے محمدؐ! ہمارے سامنے لکھی لکھائی کتاب لاؤ جسے آسمان سے ہمارے اوپر اتروا لو، اور ہم اسے بطور خود پڑھیں اور ہمارے سامنے چشمے جاری کر دو، پھر ہم تمہارے پیچھے چلیں گے اور تمہاری صداقت کی گواہی دیں گے۔"[2]

اسی رافع بن حریملہ نے یہ تقاضا بھی کیا کہ "اے محمدؐ! اگر تم اللہ کے رسول ہو، جیسے کہ تم خود کہتے ہو تو ذرا اللہ سے یہ کہو کہ وہ ہم سے بات کرے، یہاں تک کہ ہم اس کی بات خود سن لیں۔"[3]

ایک اور مجلس میں فنحاص، عبداللہ ابن صوریا، ابن صلوبا، کنانہ بن ربیع بن ابی الحقیق، اشیع، کعب بن اسد، شمویل بن زید، جبل بن عمرو بن سکینہ جیسے بزرگان یہود حضور سرور عالم سے گفتگو کر رہے تھے۔ کہنے لگے: "اے محمدؐ! کیا واقعی یہ قرآن تمہیں کوئی جن یا کوئی انسان نہیں سکھاتا؟" رسول خدا نے فرمایا: "تم خوب سمجھتے ہو کہ یہ خدا کی طرف سے ہے اور یہ کہ میں خدا کا رسول ہوں، تم اس حقیقت کو اپنے ہاں

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ صفحہ ۱۹۶ [2] ایضاً صفحہ ۱۹۷ [3] ایضاً صفحہ ۱۹۸

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تورات میں مرقوم دیکھتے ہو۔" اس پر وہ کہنے لگے: "اے محمدؐ! پھر حقیقت یہ ہے کہ جب خدا اپنے کسی رسول کو برپا کر دیتا ہے تو پھر جو کچھ بھی وہ رسول چاہے، خدا اس کے لیے وہی کچھ کر دیتا ہے اور رسول جس بات کا بھی ارادہ کرے خدا کی طرف سے وہی کچھ کر دکھانے کا اختیار پا لیتا ہے، سو تم آسمان سے ہمارے اوپر لکھی لکھائی کتاب کو اتروا دو جسے ہم پڑھیں اور پہچانیں[1]۔"

یہود نے بڑی کارگر ڈھال تلاش کر لی۔ اب کوئی سوال نہ رہا اس کا کہ داعیٔ حق کی دعوت کیا ہے؟ وہ کیا بات کہتا ہے؟ اس کے لیے دلائل کیا رکھتا ہے؟ اس کی دعوت کے اثر سے کیسی زندگی بنتی ہے؟ اس کی تعلیم و تربیت سے کس نوعیت کی سیرت پروان چڑھتی ہے؟ اس کے تعمیری کام سے کیسا نظامِ تمدن بنتا ہے؟ یہ سارے سوالات پیچھے چلے گئے اور سامنے یہ مطالبہ آگیا کہ آسمان سے کتاب اتار کے دکھاؤ جیب اب لوگوں کا منہ بند کرنے کے لیے ایک ذریعہ ہاتھ آگیا جس نے بات چھیڑی اس سے کہہ دیا کہ ہم تو ماننے کو تیار بیٹھے ہیں، لیکن ان سے جا کر کہو کہ وہ نبیٔ برحق ہیں تو اللہ میاں سے کہہ کر فدا یہ ایک نشانی دکھا دیں۔ اللہ والوں کی شان یہ ہوتی ہے کہ وہ جو کچھ چاہتے ہیں اوپر سے منوا لیتے ہیں، پھر وہ کیسا رسول ہے جس کی بات عالمِ بالا میں درخورِ اعتنا ہی نہیں ہے۔ لوگو، چھوڑو ان انتشار انگیز باتوں کو، جاؤ کسی اللہ والے کا دامن تھام لو۔ یہ تو بس یونہی ڈھکوسلہ ہے۔

(باقی)

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۲۱۹-۲۲۰

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سنّت کے بارے میں امام ابوحنیفہؒ کا موقف

[یہ مضمون ایک مصری عالم استاذ محمد ابوزہرہ کی تالیف "ابوحنیفہؒ" کے ایک باب کا ترجمہ ہے۔ منکرین حدیث و سنت اور بعض دیگر حلقوں کی جانب سے امام ابوحنیفہؒ کے خلاف حدیث کے انکار و استخفاف کا بے اصل الزام عائد کیا جاتا ہے۔ اگرچہ فاضل مصنف کے پیش نظر اس الزام کی تردید نہیں تھی، لیکن ضمناً اس الزام کا جواب بھی بحث میں آگیا ہے۔ یہ ترجمہ جناب خلیل حامدی صاحب نے کیا ہے اور امید ہے کہ وہ اس سلسلے کو جاری رکھیں گے]۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب اللہ کے بعد دوسری جس چیز کو اپنے اجتہادات اور استنباطِ مسائل کا ماخذ و مرجع بنایا ہے وہ سنتِ رسول ہے۔ ترتیبِ مراتب کے لحاظ سے کتاب اللہ کے بعد سنت کا درجہ ہے کیونکہ کتاب اللہ شریعتِ محمدی کا بنیادی ستون اور اصل سرچشمۂ ہدایت و ارشاد ہے اور کتاب اللہ ہی سے یہ امر ثابت ہوتا ہے کہ شریعت کے ماخذ و مصادر میں سے ایک ماخذ سنتِ رسول ہے۔ اسی بنا پر سنت کو مصدرِ تشریع ہونے کے اعتبار سے اور احکامِ شرعی کی بنائے استدلال ہونے کے لحاظ سے قرآن کے بعد کا درجہ حاصل ہے۔ تفاوتِ مرتبہ کی دوسری وجہ یہ ہے کہ سنت کتابِ الٰہی کی مُبَیِّن ہے (یعنی کتاب اللہ کی مجمل آیات کی تفسیر کرتی ہے، مطلق کو مقید اور عام کو خاص کرتی ہے اور محتمل المعانی نصوص کی مراد معین کرتی ہے)، اور یہ بدیہی امر ہے کہ مبیّن کا درجہ مبیَّن (جس کا بیان اور تفسیر ہو) کے بعد ہوتا ہے پس مبیّن ہونے کی حیثیت سے سنت بمنزلہ خادم اور تابع کے ہے اور کتاب اللہ متبوع اور مخدوم ہے۔ کتاب اللہ کا ماخذ اول اور سنتِ رسول کا ماخذ ثانی ہونا خود شارع علیہ السلام کے متعدد ارشادات اور صحابہ رضوان اللہ علیہم کے آثار سے ثابت ہے۔ مثال کے طور پر حضرت معاذ والی حدیث کو لیجیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت معاذؓ کو یمن کا گورنر مقرر کیا تو آپ نے حضرت معاذ سے دریافت فرمایا: "تم مقدمات کا فیصلہ کس طرح کرو گے؟" معاذؓ نے جواب دیا "اللہ تعالیٰ کی کتاب کو پیش نظر رکھوں گا۔" آپ نے ارشاد فرمایا: "اگر پیش آمدہ معاملے میں کتاب اللہ میں تمہیں کوئی رہنمائی نہ ملے تو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پھر کیا کرو گے؟ معاذ نے عرض کیا: "سنتِ رسول کی روشنی میں فیصلہ کروں گا۔" آپ نے پھر پوچھا: اگر سنت بھی اس معاملے میں خاموش ہو تو پھر کونسا راستہ اختیار کرو گے؟ معاذ نے کہا: "اجتہد برائی" یعنی ایسی صورت میں فیصلِ مقدمات کے لیے میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا۔

۲۔ دوسری مثال حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایک اثر سے ملتی ہے۔ حضرت عمرؓ قاضی شُریح کے نام ایک فرمان میں لکھتے ہیں: "اگر تمہارے پاس کوئی ایسا معاملہ آئے جس کا حکم کتابِ الٰہی میں موجود ہو تو اسی کے مطابق فیصلہ کرو۔ اور اگر کوئی ایسا معاملہ تمہاری عدالت میں پیش ہو جس کے بارے میں کتابِ الٰہی کوئی حکم نہ دے رہی ہو تو سنتِ رسول کو دیکھو اور اسی کی رہنمائی میں فیصلہ کرو۔"

۳۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "تم میں سے کسی کے پاس کوئی معاملہ پیش ہو اس کو چاہیے کہ اس کا فیصلہ کتابِ الٰہی کے مطابق کرے۔ اور اگر کوئی ایسا معاملہ ہو جس کے متعلق کتابِ الٰہی میں حکم مذکور نہ ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات پر نظر کرے اور ان ہی کے بموجب فیصلہ دے۔"

اسی طرح کا ایک اثر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔

حنفیہ کے نزدیک فرض اور واجب کا فرق

بہرحال یہ بات امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اپنے اقوال و آثار اور ان کی اپنی تصریحات سے پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ امام موصوف نے مسائلِ فقہیہ کی تخریجات اور تفریعات میں کتاب اللہ کو مقدم اور سنت کو مؤخر رکھا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ فقہائے حنفیہ نے اسی اصول کے پیشِ نظر ان احکام کے درمیان جو نصوصِ قرآن سے دلالتِ قطعیہ کے ساتھ ثابت ہوتے ہیں اور ان احکام کے درمیان جو احادیثِ ظنیہ (متواتر اور مشہور کے علاوہ احادیث) سے ثابت ہوتے ہیں، امتیاز اور فرق قائم کیا ہے۔ حنفیہ کے نزدیک وہ امر (کسی چیز کے کرنے کا مطالبہ) جو نصِ قرآنی سے صادر ہو فرض ہے اور اس کے مقابلے میں جس امر کی بنیاد ظنی الثبوت حدیث پر ہو وہ واجب ہوتا ہے۔ (اس کی وجہ یہ ہے کہ فرضیت قطعی ثبوت کی محتاج ہے اور حدیثِ ظنی سے قطعیت ثابت نہیں ہوتی بلکہ ظنِ غالب حاصل ہوتا ہے)۔

یہی تفریق وہ نہی (کسی چیز سے رک جانے کے مطالبے) کے بارے میں بھی کرتے ہیں۔ قرآن نے جس چیز سے نہی کر دی ہے، اگر اس کے مفہوم کی دلالت ظن پر نہیں ہے تو وہ چیز حرام ہے اور جس چیز کی نہی حدیثِ ظنی سے

© rasailojaraid.com